صابر ظفر
بارہ دری میں شام

بارہ دری میں شام

صابر ظفر

دانیال

انتساب

سرزمینِ ظفروال کے نام

سرورق :۔ جمیل نقش

خطاطی :۔ خالد محمود اعوان

بارِ اوّل :۔ جون ۱۹۹۶ء

طابع :۔ شادمان پرنٹرز - کراچی

ناشر :۔ حوری نورانی

مکتبہ دانیال، وکٹوریہ چیمبرز ۲

عبداللہ ہارون روڈ - صدر - کراچی

قیمت :۔ ۸۰ روپے

ترتیب

صابر ظفر کی شاعری کا نیا موڑ

مَیں صابر ظفر کے شعری سفر کو گزشتہ ۲۵ سال سے دیکھ رہا ہوں۔ اُن کا پہلا مجموعہ "ابتدا" تھا جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا اور زیرِ نظر مجموعہ اُن کا آٹھواں مجموعہ ہے۔ "ابتدا" کے بعد "دُھواں اور پھول"، "پاتال"، "جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی"، "دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے"، "لہو ترنگ"، اور "دُکھوں کی چادر" شائع ہوئے اور اب "بارہ دری میں شام"۔ صابر ظفر کی شاعری ایک دل شکستہ شاعر کا اظہارِ عدم اطمینان Note of dissatisfaction نظر آتی رہی ہے۔ ایک ایسے دور میں جب تیسری دُنیا کا شاعر محض عادتاً ہی خوش مزاج اور رومان پسند ہو سکتا ہے۔ صابر ظفر کی شاعری ایک شاعر کی نیم دلانہ شکایتی لہجہ اور دھیمے احتجاجی رویّہ سے عبارت رہی ہے۔ میں نے اکثر صابر ظفر کی شاعری کو اِس طرح پڑھا ہے جیسے رجائیت کے شہر میں خوابوں اور ناخوشگوار سنگلاخ حقائق پر حزن و ملال کی کڑی حقیقتوں سے روشناسی بھی ضروری ہو، ایسا نہیں ہے کہ اِس نوع کی حقیقتیں ہمارے تجربات سے باہر نہ پائی جاتی ہوں لیکن ہم میں سے اکثر افراد انتہائی شکستگی کے عالم میں بڑے مہم جُو اور رومانی نظر آتے ہیں اور صرف نظر ہی نہیں آتے بلکہ اپنے چہرے پر رجائی نقاب Mask اوڑھے رہتے ہیں اور یہ نقاب ایک ایسی زبان اور رویّہ کو جنم دیتا ہے جو حقیقت سے قطعاً بعید ہی

نہیں ہوتا بلکہ سراسر فریب نظر ہوتا ہے اور ہم اس صورت حال کے ادبی اظہار کو حقیقی اظہار سمجھ کر اپنے لئے کافی مشکلات پیدا کر لیتے ہیں اور خود وہ شاعر بھی اپنے نقاب Mask کو حقیقی Real سمجھ بیٹھتا ہے اور اس طرح ایک سراب اور دوسرے سراب میں رشتۂ ابلاغ بھی قائم ہو جاتا ہے۔

صابر ظفر کے یہاں مجھے کبھی ایسے احساسات سے واسطہ نہیں پڑا۔ جس کی واقفیت کے بارے میں شکوک پیدا ہوئے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ تیسری دنیا کے جس سماج میں ہم رہتے ہیں وہاں زندگی بسر کرنے کا مابعد الطبیعاتی نظام ٹوٹ چکا ہے اور اس کی جگہ تا حال کسی اور نظام نے نہیں لی ہے سماجی اقدار اور نظریۂ علم بھی اتھل پتھل کا شکار ہو گیا ہے اور اس طرح شاعری کی دنیا بھی الٹ پلٹ ہو گئی ہے۔

صابر ظفر شکستگیٔ اقدار کے نتیجہ میں پیدا ہوتے والی شعری زبان و محاورہ کے شاعر ہیں وہ جس صورت حال سے دوچار ہیں اس نے شاعری کی ایک ایسی زبان وضع کرنے کا بھی کام سونپا ہے جو ان کے تجربات کی کھردراہٹ یا کلبیت Cynicism کو موزوں زبان دے سکے اور وہ لائق مبارکباد ہیں وہ اپنی آواز کے تعجب انگیز حد تک پیکر تراشتے ہیں اور اس طرح کہ یک بیک صدائے تحسین بلند ہو جاتی ہے۔

زیر نظر شعری مجموعہ کم از کم میرے لئے باعث استعجاب ثابت ہوا، صابر ظفر اس مجموعے میں ایک رومانوی شاعر ہیں تازہ ترین مجموعہ سے پیشتر وہ جدید مفہوم میں رومان شکن Anti Romantic شاعر تھے لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ دردوں بینی ان کا خاص میدان تھا، ظاہر ہے کہ وہ تغزل کے قریب کیوں پھٹکتے، ان کی شاعری اپنے محبوب کے سراپا پر دوسروں کو دعوت تحسین دینے کی بجائے خود اپنی بوالعجبیوں پر ہنسنے ہنسوانے کا سامان فراہم کیا کرتی ہے۔ یہی ایک ایسا جدید نقطہ نظر ہے جو تغزل کی فضا سے یکسر انحراف کا نتیجہ تھا۔ یہی وہ رویہ ہے جس نے مشاعرہ کے دلدادگان

کو تغزل کا عاشق بنا رکھا ہے اور ہمارے بعض شعرا طلب و رسد کے دور میں وہی کچھ پیش کر رہے ہیں جس کی مانگ ہے لیکن صابر ظفر، سنجیدہ ادب کے قارئین کے سامنے معاشرتی اقدار کے شکستہ آئینہ Splintered Glass میں اُتنے ہی چہرے دکھا رہے ہیں جتنے کہ شیشے کے ٹکڑے، تو کیا یہ مقامِ تعجب نہیں ہے کہ صابر ظفر نے اپنے تازہ ترین مجموعے میں اوّلین محبت کے متعدد جاں گسل لمحات کے دلکش Frames مہیا کئے ہیں سوچتا ہوں کہ صابر ظفر کے ذہن میں کیا کچھ محفوظ تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ یہ بتانا چاہتے ہوں کہ وہ جب چاہیں اپنے رومانوی وجود Romantic Self کو دوبارہ زندہ Recall کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم ان کی داستانِ عشق کے بیان میں غزلِ مسلسل بلکہ دو غزلے اور سہ غزلے پڑھتے ہوئے یوں محسوس کرتے ہیں کہ پہلی محبت کے نقوش کس قدر گہرے ہیں اور ان کی حکایتِ شوق کی ایک ایک تفصیل بڑے پیار کے ساتھ بیان ہوئی ہے یوں لگتا ہے ہم جسمانی محبت کے تمام مراحل سے بے اختیارانہ جذبات کے بہاؤ کے گواہ ہونے کے باوجود شاعر کے منفرد لب و لہجہ کی بلوغت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسا نہیں کہ پچاس سال پہلے کی رومانی شاعری جیسی شاعری دوبارہ Replay ہو رہی ہو۔ بالکل نہیں یہ ایک ایسے شاعر کی بازدید کا بیان ہے جس کی آنکھیں محبوبہ کی آہٹ کی بجائے ہم عصری زمانے کی دماؤش نے کھولی ہوں اور شاید اسی لئے شاعر کی آنکھیں ہمارے وقت کی آنکھیں ہیں اور یہ وہ آنکھیں ہیں جو صرف اپنی محبت کے بارے میں جاندار ہوں یہ آنکھیں دُنیا کو صرف ہیر اور رانجھا کے انداز میں دیکھنے کی قائل نہیں بلکہ یہ آنکھیں کیدو کی طرح بھی دیکھتی ہیں یہ آنکھیں رومان اور اُس کی یکسر مختلف کیفیت پر حاوی ہیں اور اسی لئے ان آنکھوں میں ایک رمز ہے اور یہ وہ رمز ہے جو اِس دور کے ایک حساس شاعر کو ایک اُلجھن اور ایک خلجان میں مبتلا کئے رہتا ہے یہ بے چینی صرف خلّاق ذہنوں کے حصے میں آتی ہے اور

یہ بے چینی ہی اُن ذہنوں کا قیمتی اثاثہ ہے جس کے ذریعے وہ بدلتی ہوئی دُنیا کے حقائق کو نئی زبان دیتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ہم رنگ تبدیلیاں اسی وقت بامعنی بنتی ہیں جب اُنہیں موزوں اظہار کی دولت بھی مل جائے۔

زیر نظر کتاب کے مندرجہ ذیل اشعار پر غور کریں اور اندازہ لگائیں کہ شاعر کی زبان سے نکلنے والا سچا اظہار کس قدر جلد ہم سب کا اظہار بن جاتا ہے اور اس طرح شاعر ہمارے معاشرے کا سب سے زیادہ Productive جزو بن جاتا ہے۔

ہماری روزمرّہ سماجی اور ادبی زبان کا ہمہ وقت ارتقاء اسی قدر ضروری ہے جس طرح ہمارے جسموں کی ستر پوشی کرنے والے ملبوسات، صابر ظفر اپنے ہم عصروں کے درمیان خاصے مختلف تیور اور لہجے کے شاعر ہیں ان کے اکثر اشعار پڑھتے اور سُننے وقت پہلی سطح پر اجنبی لگتے ہیں لیکن گہری سطح پر ایک ایسے سچے شاعر کے شعر معلوم ہوتے ہیں جو اپنے مختلف ہونے پر پریشان سے زیادہ مطمئن نظر آتا ہے آپ دیکھیں گے کہ اِن اشعار میں صابر ظفر نے بے تکلفانہ طور پر پنجابی زبان کے الفاظ استعمال کیے ہیں یہ طریقہ کار شیر افضل جعفری، عبدالمجید بھٹی، شریف کنجاہی، ظفر اقبال اور مسعود منوّر کے ہاں بھی نظر آتا ہے لیکن صابر ظفر کے یہاں پنجابی اور اُردو کا آمیزہ جدید اظہار کی ضرورت پوری کرتا ہے محض لسانی رومانس نہیں، اس مجموعہ میں پنجابی کے ساتھ ہندی الفاظ بھی بے محابہ آئے ہیں اور اس طرح یہ مجموعہ ایک ایسا طویل محبت نامہ بن گیا ہے جس میں ایک غزل کے بعد دوسری غزل میں نارسائی اور وصل کی کیفیات نہایت خوبصورتی کے ساتھ رقم ہوئی ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ صابر ظفر نے یہاں بھی محبت کی کیفیات کے متنوع Shades پیش کیے ہیں ان کیفیات میں جذباتیت نہیں بلکہ ایک ایسا بالغ رویّہ کارفرما نظر آتا ہے جو خواب اور شکستِ خواب کی لذّت اور تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کرنے پر قادر ہو۔

کبوتر قید اگر کرتا ترے جیون کی چھتری کے
ترے بابل کے محلوں پر حکومت ہو بھی سکتی تھی

میں جاتا تھا اُسی کی سمت سنگل توڑ کر سارے
مری دیوانگی کی یہ علامت ہو بھی سکتی تھی

کسی میٹیار کا سنجوگ غیروں سے تھا ناممکن
کہ یہ اُس کے قبیلے کی روایت ہو بھی سکتی تھی

تر نجن میں تجھے تکنے زمیں پر چاند اُتر آیا
کہ مجھ ناچیز سے اُس کو رقابت ہو بھی سکتی تھی

پرانی داستانوں کا بیاں چوپال کے اندر
وہاں اپنی کتھا کہنے کی جرأت ہو بھی سکتی تھی

اگن تھی خیمہ گاہ میں، سہاگ کے الاؤ کی
کہ جس سے دشت سارا جل اُٹھا عجب عجب طرح

رُوپ میرا، لاٹ سُلفے کی ہو جیسے
کھینچتا وہ کش تو جل اُٹھتی رہی میں

مندرجہ بالا اشعار کے آخری شعر سے ہم چونک پڑتے ہیں کہ صابر ظفر نے

اِس مجموعہ میں پنجابی شاعری کی روایت کی پاسداری بھی کی ہے بعض غزلیں پنجابی اور ہندی گیتوں کی طرح عورت کے جذبات کا اظہار ہیں لیکن وہ (عورت) ہیر کی طرح مرد محبوب کی عاشق ہے۔

رات ساری جاگتی سوتی رہی مَیں
ایک میٹھے درد میں ڈوبی رہی مَیں

ہونٹ اُس کے، آنکھیں اس کی، ہاتھ اُس کے
چُومنے کے خواب ہی بُنتی رہی مَیں

اُس کے جذبوں کو بلونا چاہتی تھی
اِک مدانی کی طرح چلتی رہی مَیں

اُس کی سانسوں کی رفاقت راس آئی
جھوٹ یہ سچ کی طرح کہتی رہی مَیں

پل دو پل کی چاہت میں
زرد ہوئی مَیں رنگت میں

لگ جا میرے سینے سے
کیا رکھا ہے نفرت میں

پار لگاتی کیا تجھ کو
ڈوب گئی خود لذت میں

تجھ سے ملی تو ہوش آیا
اب تک تھی میں غفلت میں

تجھ سے ملوں یا ساجن سے
نکلوں کاش اِس اُلجھن سے

جانے ملے کِس عمر میں وُہ
چاہا جِس کو بچپن سے

الغرض زیرِ نظر مجموعہ ایک عجیب کیف آگیں مجموعہ ہے اس میں جو کچھ ہے وہ انسانی تجربہ کا بہت بدیہی اور فی الفور اظہار ہے لیکن ہماری شاعری کے خزانہ میں جس خوبصورتی کے ساتھ شامل ہو پایا ہے وہ اِس مجموعہ کی شاعری کو حیرت انگیز اور ایک قدرے مختلف شعری مجموعہ بنا دیتا ہے اس مجموعہ میں پنجاب رس/شعری رس، اردو زبان کے ساتھ اس قدر شیر و شکر ہوا ہے کہ پُورا مجموعہ کہیں احساس اور کہیں فکر کی نغمگی میں ڈوبا ہوا ملتا ہے۔

قارئینِ ادب اِسے نہ صرف دلچسپی سے پڑھیں گے بلکہ اِسے دوسرے ہم عصروں کی کاوشوں سے کافی مختلف پائیں گے۔ اس مجموعہ کا شاعر اپنی دھرتی سے، اپنے گیان سے اور اردو پنجابی کے اشتراک سے پیدا ہونے والی ایک حیرت انگیز

تو (لاٹ) سے خود بھی متاثر نظر آتا ہے۔ صابر ظفر نے اِس مجموعہ میں اوّل سے آخر تک سرمستی اور سرخوشی کے لئے جو شعری رویّہ بنایا ہے وہ کہیں وجودی اور کہیں متصوفانہ رنگ اختیار کرتا چلا جاتا ہے اور میرے خیال میں یہ اس مجموعہ کی ایک بڑی خوبی ہے

اب مَیں سوچتا ہوں تو یاد نہیں کچھ آتا
اُس کے جانے پر بھی کیا کیا رہ جاتا تھا

نیند مری آنکھوں سے رخصت ہو جاتی تھی
بس آنکھوں میں اُس کا سپنا رہ جاتا تھا

آنکھوں سے نیند رُخصت ہو جانے کی باتیں تو اکثر سننے میں آتی ہیں لیکن آنکھوں میں سپنا رہ جانے کی اذیت زیرِ نظر مجموعہ کے شاعر کے حصّے میں عجب سج دھج سے آئی ہے مَیں اِس مختصر مضمون کو اِس مجموعہ کے آخری شعر پر اس اُمید کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ شاید اِس شعر میں بھی شاعر کے انفرادی لب و لہجہ کی بھرپور نمائندگی ہو جاتی ہے۔

مَیں کتنا مرتا تھا اُس پر ظفر کہوں کیا
بس اِتنا مرتا تھا، زندہ رہ جاتا تھا

محمّد علی صدیقی

محبّت ہو نہیں پائی محبت ہو بھی سکتی تھی
یہ دل دیوانہ بن جاتا تو قربت ہو بھی سکتی تھی

کبوتر قید اگر کرتا ترے جیون کی چھتری کے
ترے بابل کے محلوں پر حکومت ہو بھی سکتی تھی

مَیں تیرے دھیان کی شمعیں اگر رکھتا نہ ساتھ اپنے
تو اُس بارہ دری میں شام غارت ہو بھی سکتی تھی

جہاں تالاب تھے اور حوض میں پریاں نہاتی تھیں
وہ جنت تو نہیں تھی ویسے جنت ہو بھی سکتی تھی

خبر کرتا ہوا پہنچا محل کے ساتویں در تک
اچانک جا پہنچتا تو شکایت ہو بھی سکتی تھی

خدا شاہد ہے اُس کے وصل کی نوبت نہیں آئی
نصیب اس خواب گہہ میں یہ سعادت ہو بھی سکتی تھی

مَیں جاتا تھا اسی کی سمت سنگل توڑ کر سارے
مری دیوانگی کی یہ علامت ہو بھی سکتی تھی

مسلسل لکھتا جاتا یا مسلسل بولتا جاتا
کسی عاشق کے جذبے میں یہ شدت ہو بھی سکتی تھی

مَیں اس کی بزم میں تصویر کی صورت پڑا رہتا
تھا یارا عشق کا، مجھ میں متانت ہو بھی سکتی تھی

کسی ہتیار کا سنجوگ غیروں سے تھا ناممکن
کہ یہ اُس کے قبیلے کی روایت ہو بھی سکتی تھی

مَیں اُس کے چاہنے کے باوجود اُس کا نہ ہو پایا
مجھے اپنے تغافل پر ندامت ہو بھی سکتی تھی

میں ہارا اس لئے تھا، مَیں نے تجھ پر فیصلہ چھوڑا
مری منصف مرے دل کی عدالت ہو بھی سکتی تھی

مجھے فرصت نہیں تھی گاؤں والوں سے الجھنے کی
تری خاطر میسّر ایسی فرصت ہو بھی سکتی تھی

ترنجن میں تجھے تکنے زمیں پر چاند اُتر آیا
کہ مجھ ناچیز سے اُس کو رقابت ہو بھی سکتی تھی

مجھے تیرے محلّے کا پتہ جس نے بتایا تھا
اُسے مجھ سے کبھی کوئی کدورت ہو بھی سکتی تھی

شکستہ دل تھا شاید اس لئے نرمی تھی لہجے میں
مگر اُس کے رویّے میں رعونت ہو بھی سکتی تھی

شناسا تھے مرے جذبات اُس کی گرمجوشی سے
مری حالت تھی جو، وہ اُس کی حالت ہو بھی سکتی تھی

ادھوری سی جو لڑکی تھی اُسے آخر یقین آیا
مجھے پا کر مکمل ایک عورت ہو بھی سکتی تھی

مَیں ٹوٹی سیڑھیوں میں مضطرب تھا اور وہ چھت پر
کبھی تنہائی میں پیدا یہ صورت ہو بھی سکتی تھی

بچھڑ کے زہر کھا لوں گی، کنویں میں گر کے جاں دوں گی
بظاہر ایک دھمکی تھی، حقیقت ہو بھی سکتی تھی

وہ زرخیزی بدن کی جیسے کوئی کھیت سرسوں کا
مری ترسی ہوئی جاں کی ضرورت ہو بھی سکتی تھی

دریچے میں اُجالا اُس کے ہونے کا حوالہ تھا
وگرنہ رات کی تقدیر، ظلمت ہو بھی سکتی تھی

محل سے بھاگنا اور جھونپڑی میں آ کے رُک جانا
اگر مجبور کرتا دل، یہ ہجرت ہو بھی سکتی تھی

وہ راضی ہی نہیں تھا دھڑکنوں کے ساتھ چلنے پر
وگرنہ دل سے دل تک طے مسافت ہو بھی سکتی تھی

اُسی کی بے وفائی نے مجھے بُزدل بنا ڈالا
وگرنہ رسمِ دنیا سے بغاوت ہو بھی سکتی تھی

محبت کیا ہے نفرت کیا، ہوس نے سب بھلا ڈالا
ہمیشہ جاگزیں اُس دل میں چاہت ہو بھی سکتی تھی

جسے گاؤں کے چوبارے پہ تنہا چھوڑ آیا ہیں
نظرِ وہ مہرباں مجھ پر نہایت ہو بھی سکتی تھی

نہ تھی قوموں سے دلچسپی مگر ہائے وہ کشمیرن
مرے جیون کا حاصل جس کی سیرت ہو بھی سکتی تھی

سہاگن چھوڑ کر پھر بھی پہنچا اس کنواری تک
اگرچہ میری قاتل میری وحشت ہو بھی سکتی تھی

چُرا لیتا نہ دل میرا اگر وہ سانولا مکھڑا
جدھر سب تھے ادھر مائل طبیعت ہو بھی سکتی تھی

مَیں اس محبوب کو اُس کے مکاں تک دیکھ آیا ہوں
کہ سپنوں میں عطا ایسی بصارت ہو بھی سکتی تھی

ازل سے حسن والوں کی غلامی میں رہا ہوں مَیں
سو مجھ پر اُن کی ہر مرضی مسلّط ہو بھی سکتی تھی

ادھر جب گھنٹیاں بجتی تھیں گرجا گھر کے ماتھے پر
نصیب اُس وقت اُس رُخ کی زیارت ہو بھی سکتی تھی

مری سوچوں کی گہرائی، تغیر اور تنہائی
مگر اُس بت پہ مر مٹنے کی ہمت ہو بھی سکتی تھی

پرانی داستانوں کا بیاں چوپال کے اندر
وہاں اپنی کتھا کہنے کی جرأت ہو بھی سکتی تھی

وہ دن کا واقعہ تھا اور اب تو ہو گئی ہے رات
میسر رات کو دن جیسی راحت ہو بھی سکتی تھی

زلیخا دامنِ یوسف سے لپٹی رو رہی ہو گی
کہ اک مجبور دل کی کوئی قیمت ہو بھی سکتی تھی

مسائل اور بھی تھے میرے مگر لکھتا رہا کچھ اور
مَیں غافل تو نہیں تھا ویسے غفلت ہو بھی سکتی تھی

مَیں سب کے ساتھ رہتا تھا اسی باعث تھا سب جیسا
مگر حاصل مجھے سب پر فضیلت ہو بھی سکتی تھی

مری منزل تھی مستقبل مگر ماضی میں رہتا تھا
اور ایسا کیوں تھا اِس میں کوئی حکمت ہو بھی سکتی تھی

وہ جس مصرعہ سے خوش ہوتا مَیں کہتا اور مر جاتا
برابر شعر کہنا میری عادت ہو بھی سکتی تھی

مجھے خواہش نہیں ہے محفلوں میں داد پانے کی
مخاطب یار ہوتا تو یہ حسرت ہو بھی سکتی تھی

مجھے پروا نہیں لیکن ترا کہنا ہو سچ شاید
مِری شہرت میں حائل میری غربت ہو بھی سکتی تھی

تڑختی ٹوٹتی سنجیدگی سے عمر جو گزری
وہ اک معصوم بچے کی شرارت ہو بھی سکتی تھی

اسے بھی لے گیا ہمراہ اپنے ڈوبتا سورج
نہ لے جاتا تو یہ اُس کی عنایت ہو بھی سکتی تھی

مَیں اک پنسل کی صورت خود کو اکثر شارپ کرتا تھا
کہ ایسے خوشنما تحریرِ الفت ہو بھی سکتی تھی

غزل کی اِس فضا سے اختلافِ رائے ممکن تھا
مگر اِک آپ بیتی کی حمایت ہو بھی سکتی تھی

مجھے اُس یار کے پہلو کی مٹی میں سلا دینا
کہیں محفوظ اک ایسی وصیت ہو بھی سکتی تھی

وہ ساری کٹ چکی تھیں بالیاں جتنی تھیں گندم کی
مری ہم رقص دیوالی میں خلقت ہو بھی سکتی تھی

وہ مجھ کو دیکھتا کیوں تھا جھروکے سے کہ جب میری
کوئی حرمت نہ تھی حالانکہ حرمت ہو بھی سکتی تھی

اکیلا ہو گیا ہوں میں کہ مجھ جیسا نہیں کوئی
کوئی مجھ جیسا ہوتا تو رفاقت ہو بھی سکتی تھی

کلی مُرجھا چکی ہوگی، جو اب سونی حویلی میں
اُسے صابرؔ ظفر سے کوئی نسبت ہو بھی سکتی تھی

پل دو پل کی چاہت میں
زرد ہوئی ہیں رنگت میں

ڈھونڈ رہی ہوں جوانی کو
پچھلی رات کی صحبت میں

لگ جا میرے سینے سے
کیا رکھّا ہے نفرت میں

جینا اگر دُشوار ہُوا
مر جاؤں گی محبت میں

اپنے آپ کو پہچانا
مَیں نے تیری قربت میں

پار لگائی کیا تُجھ کو
ڈُوب گئی تو لذّت میں

تُجھ سے ملی تو ہوش آیا
اب تک تھی مَیں غفلت میں

ساری عزّت کھو کر بھی
کمی نہ آئی عزّت میں

گزُر کے دہر کے دوزخ سے
پہنچی ہوں مَیں جنّت میں

سارا اضافہ تُو نے کِیا
میرے پیار کی شدّت میں

اور کسی کو نہیں دیکھا
مَیں نے تیری صورت میں

ساری دشواری دیکھی
مَیں نے ایک سہولت میں

مَیں نے تجھے سنبھالا تھا
مِلا تھا تُو کِس حالت میں

سب کچُھ تمہیں بتاؤں گی
ملنا تم کبھی فرصت میں

تیری ہی اِک یاد آئی
مجُھ کو تو بس ہجرت میں

بھُولی تجھے مری صورت
کیا دیکھا تھا سیرت میں

ترس رہی ہُوں اُس گھر کو
چھوڑ دیا جو وحشت میں

سب کو پیار نہیں مِلتا
لکھا ہے یہ وصیّت میں

سوچ بچار ضروری ہے
عہد کروں کیا عجلت میں

ساری دُنیا جانی ہے
مَیں ہوں کس کی حمایت میں

پہلے مری محبت تھا
شامل ہے اب عادت میں

ساری عُمر کے روگ لگے
چار دنوں کی چاہت میں

یہ جو سلوک ہُوا مجھ سے
ہوتا ہے کیا چاہت میں

کوئی کسر نہیں چھوڑی
مَیں نے تیری زیارت میں

تیرا پیار اگر ملتا
جی لیتی مَیں عُسرت میں

ظاہر باطن ایک مرا
دیکھا تُو نے خلوت میں

شاید اِسی کا نام ہے عشق
کمی نہ آئی رغبت میں

میرے رُوپ کا جادُو ہے
تیری شان و شوکت میں

دل سا نگر نہیں دیکھا
مَیں نے سیر و سیاحت میں

گلی محلّے ختم ہوئے
اپنی نئی سکونت میں

عزّت نفس گنوا ڈالی
مَیں نے تیری خدمت میں

مجھ کو بھی شامل کر لے
اپنے ہُنر کی طاقت میں

تُو نے خیانت کر ڈالی
میری ایک امانت میں

رات کی بات کو بھول بھی جا
مَیں ہوں غرق ندامت میں

کھینچ ہی لاؤں گی تجھ کو
اِک دِن دل کی عدالت میں

سوچوں دیکھ کے ظلم ترا
کیا ہے دیر قیامت میں

تُو نے شامل کر ڈالا
کتنا جھوٹ حقیقت میں

تُو نے میرا نام لکھا
کیوں اشیائے ضرورت میں

مجھ کو بھی کھو ڈالا ہے
تو نے آج رعونت میں

ظالم تُو نے بگاڑ دیا
سارا کھیل کدورت میں

کل اک نئی سحر ہو گی
بُھول گیا تُو ظُلمت میں

کرتے رہے گمراہ مجھے
کیا کیا نقش مسافت میں

جب تک تیرا ظُلم رہا
شامل رہی بغاوت میں

غارت کر دی میری شام
تُو نے آج شرارت میں

ہو گیا تیری باندی کا
آٹا گیلا غربت میں

پردہ پوشی جو کرتا
کوئی نہیں تھا خلقت میں

مَیں تو کہیں کی نہیں رہی
رہ کے تیری رفاقت میں

بے حُرمت کوئی کیا جانے
کیا ہوتا ہے حُرمت میں

ایسا اُچاٹ ہُوا ہے جی
لگتا نہیں عبادت میں

تیرا ہے کوئی دخل ضرور
اِس بے چین طبیعت میں

غیر کے ہاتھوں بیچ دیا
میرا عشق رقابت میں

تیری بھی قیمت شامل کی
مَیں نے اپنی قیمت میں

سیدھا سادا پیار مرا
پڑ گئے آپ سیاست میں

اپنا کیس خراب کیا
مَیں نے تیری وکالت میں

کتنے تار ہمارے ہیں
اِس دستارِ فضیلت میں

پہلے بربادی میں شریک
اب مصروف نصیحت میں

اپنا بنا کے تُو نے مجھے
ڈال دیا ہے مصیبت میں

جب بھی ہوئی خوشی، یاد آیا
کاٹی عُمر اذیّت میں

ہیرا بھی سودا کر ڈالا
تُو نے عیش و عشرت میں

میرا کون سا کام کیا
لے کر مجھ کو رشوت میں

تُو نے مجھ کو پلا دیا
زہر ملا کے شربت میں

مجھ کو بھی جُھٹلا ڈالا
تُو نے رب کی نعمت میں

مجھ کو اپنا ہوش نہیں
کیا لکھوں تری مدحت میں

ساری عُمر گنوا ڈالی
مَیں نے صرف ریاضت میں

شاید منزل مل جاتی
بھٹکی تری قیادت میں

ہم جو راہ پہ آئے نہیں
کوئی کمی تھی ہدایت میں

رس کی بجائے گھول دیا
تو نے زہر سماعت میں

کیا جانے کب آئیں ظفرؔ
اچھے لوگ حکومت میں

دِکھا کے اپنے حُسن کی ادا ، عجب عجب طرح
وہ رات مجھ پہ مہرباں ہُوا ، عجب عجب طرح

وہ پہلا پہلا تجربہ تھا عشق میں وصال کا
چلی جو سسکیوں بھری ہَوا ، عجب عجب طرح

برہنگی میں جسم پر تھی اِک قبائے تیرگی
قبا کا بند بند پھر کھُلا ، عجب عجب طرح

تمام شب گواہ تھی ، شکن شکن لباس کی
وہ درد سے بکھر بکھر گیا ، عجب عجب طرح

اُسی کا یہ شعار تھا ، اسی کو اختیار تھا
بدن سے میری روح کھینچنا عجب عجب طرح

ہم ایک دوسرے کے سنگ سنگ بھیگتے رہے
اُٹھایا لُطف بوند بوند کا، عجب عجب طرح

خرام میں تھا اُس کے آمدِ بہار کا غرُور
کہ مہکا باغ اِک سرُور کا عجب عجب طرح

بس ایک بار کام اُس کے میرا عشق آ گیا
وہ مجھ پہ ہو گیا فریفتہ، عجب عجب طرح

مسہریوں سے دُور دونوں یُوں زمیں پہ سو گئے
کہ آسمان رشک سے جُھکا، عجب عجب طرح

بس ایک بار اُس نے اپنے پاس کیا بلا لیا
لکھا وہ مَیں نے ایک واقعہ، عجب عجب طرح

مری ضرورت ایک سے زیادہ محفلیں رہیں
سو مَیں نے پُر کیا تھا یہ خلا، عجب عجب طرح

قریب ایک مورتی کے مَیں جو رات سو گیا
کھُلا عقیدہ میرے عشق کا ، عجب عجب طرح

بدن سے اُس کے چھَن رہی تھیں کرنیں پچھلی رات کو
گماں ہوا طلوعِ صبح کا ، عجب عجب طرح

نہیں تھا یاد رنگ وصل کا، بس اتنا یاد ہے
چمک رہی تھی ہاتھ پر حِنا ، عجب عجب طرح

گزارنا پڑی تھی رات اِک پلیٹ فارم پر
کِیا وہاں بھی ہم نے رتجگا ، عجب عجب طرح

وہ رنگ رنگ تتلیاں مجھے بہت پسند تھیں
ہُوائیں اُن کے عشق میں فنا ، عجب عجب طرح

فریم سے نکل کے دیوی آ گئی مرے گلے
خدا سے مَیں نے کی یہ التجا ، عجب عجب طرح

سمجھ رہا تھا مَیں کہ وہ بہت کٹھور ہے مگر
شباب سے عیاں ہوئی حیا، عجب عجب طرح

نہ تھی مجال اُس کی، وہ گرفت سے نکل سکے
بچھایا جال مَیں نے چاہ کا ، عجب عجب طرح

اُسی کے حُسن کا وجود تھا اُفق کے پار بھی
کہ آفتابِ عشق ادھر گیا، عجب عجب طرح

عجب طرح کا مشغلہ تھا اُس کا راہِ عشق میں
بکھیر کر مجھے سمیٹنا ، عجب عجب طرح

سلوک میں تپاک کا طلسم بے پناہ تھا
کہ ٹپکا رَس کوئی نباہ کا ، عجب عجب طرح

مرے وجود سے لپٹتے ہی سُلگ سُلگ اُٹھا
وہ حُسن ہجر میں بجھا ہُوا ، عجب عجب طرح

لگاتا گھاؤ وہ نئے نئے مگر کبھی کبھی
پرانے زخم بھی کریدنا، عجب عجب طرح

کوئی تو بات تھی کہ بے سبب نہ تھا مرے لیے
وہ اُس کا اپنے گھر سے بھاگنا، عجب عجب طرح

ہم ایسی ستر پوشیوں سے بے لباس ہی بھلے
دریدہ ہو کے رہ گئی انا، عجب عجب طرح

سرشت میں تھا جس کے ٹوٹنا وہ میرے عشق میں
لچکتی شاخ کی طرح جُھکا، عجب عجب طرح

نقاب اُٹھ گئے سبھی، حجاب اُٹھ گئے سبھی
یہ مرحلہ کٹھن بھی طے ہُوا، عجب عجب طرح

اگن تھی خیمہ گاہ میں سہاگ کے الاؤ میں
کہ جس سے دشت سارا جل اُٹھا، عجب عجب طرح

ہمیشہ در بدر پھرا کہ اِک خیال کا سِرا
مَیں ساری عمر ڈھونڈتا رہا، عجب عجب طرح

ہم ایک دوسرے کو دیکھتے تھے جس کے سامنے
ہُوا وہ چُور چُور آئنہ، عجب عجب طرح

رہا نہ یاد جس کا ذائقہ، وہ سوزِ گُم کا ثمر
ہزار مرتبہ اُسے چکھا، عجب عجب طرح

مجھے ہیں یاد ساری کردنیں وصال و ہجر کی
کبھی ملا کبھی ہُوا جُدا، عجب عجب طرح

وہ کیسے کیسے مضطرب رہا مرے فراق میں
سُنایا اُس نے سارا ماجرا، عجب عجب طرح

کتاب تھا ورق ورق الگ الگ کیا گیا
گلاب تھا مَسل دیا گیا، عجب عجب طرح

مگر نہیں ہے یاد کس کنارے کس گھڑی لگا
مَیں آبجوئے حُسن میں بہا، عجب عجب طرح

شفق کے رنگ میں وہ کیوں نہ ڈوبتا مرے لیے
کہ مَیں نے کی تھی وصل کی دُعا، عجب عجب طرح

نہیں تھا موجۂ ہوا تو کون تھا وہ باغ میں
جو ہر کلی کو چھیڑتا رہا، عجب عجب طرح

وہ پا بہ پا قریب تھا، وہ لب بہ لب نصیب تھا
نشہ چڑھا اُسے شباب کا، عجب عجب طرح

شراب کا وہ جام تھا کہ جس میں مثلِ ماہتاب
میں ساری رات ڈوبتا رہا، عجب عجب طرح

بلادکار ہو گیا تو ظُلم ہو گیا، مگر
عبث ہے بار بار تذکرہ، عجب عجب طرح

ابد کی شاخ پہ خزاں، ازل کی شاخ پر بہار
وہ شاخ شاخ جھولتا رہا، عجب عجب طرح

نہ کوئی ڈر شروع کا، نہ کوئی خوف انت کا
وہ رات زیبِ داستاں ہُوا، عجب عجب طرح

سفید کیا سیاہ کیا کہ عشق میں گُناہ کیا
ہر ایک رنگ میرا ہو گیا، عجب عجب طرح

پہنچ گیا تمھارا رات میں تو اُس کی بزمِ خاص میں
جلا ہُوا کبھی بجھا ہُوا، عجب عجب طرح

حویلیاں اُجڑ گئیں، سہیلیاں بچھڑ گئیں
خطوط اُن کے ہاتھ بھیجنا، عجب عجب طرح

کہاں گئے وہ قافلے، کہاں گئے وہ ولولے
کوئی مجھے پکارتا رہا، عجب عجب طرح

اسی کا ہو کے رہ گیا کہ اُس نے بھی ہر ایک بار
دمِ وداع روکا راستہ ، عجب عجب طرح

وہ سیڑھیاں نہیں رہیں ، وہ ڈیوڑھیاں نہیں رہیں
جہاں وہ میرا منتظر رہا عجب عجب طرح

مَیں جتنی دیر اُس گلی میں گھومتا رہا ظفرؔ
دریچہ دل کا اُس نے وَا کیا ، عجب عجب طرح

رات ساری جاگتی سوتی رہی مَیں
ایک میٹھے درد میں ڈوبی رہی مَیں

ہونٹ اُس کے آنکھیں اُس کی ہاتھ اُس کے
چُومنے کے خواب ہی بُنتی رہی مَیں

رہ گئی تھی اُس کی خُوشبو پاس میرے
اپنی سانسیں اُس سے مہکاتی رہی مَیں

دیکھتی تھی اور پرکھتی تھی جہاں کو
لیکن اُس کے عشق میں اندھی رہی مَیں

ریت کی صورت عیاں تھی پیاس اُس کی
ایک دریا کی طرح بہتی رہی مَیں

فصل ایسی تھی، سہاگن کوئی جیسے
بیج وہ بوتا رہا اُگتی رہی مَیں

اُس کے نینوں کے کٹوروں میں ہمیشہ
مَے کی صورت خود کو چھلکاتی رہی مَیں

رُوپ میرا، لاٹ سُلفے کی ہو جیسے
کھینچتا وہ کش تو جل اُٹھتی رہی مَیں

تن کے طائر کو نہ سمجھے نیم جاں وہ
اِس لئے کچھ پھڑپھڑاتی سی رہی مَیں

خُشک کھیتی کی طرح تھا جسم اپنا
ایک دَتّر سے ہری ہوتی رہی مَیں

اُس کے جذبوں کو بلونا چاہتی تھی
اِک مدانی کی طرح چلتی رہی مَیں

مہرباں بھونرا تھا یُوں مُجھ پر کہ جیسے
سارے گلشن میں فقط کھِلتی رہی ہَیں

پھُول سے کانٹے جُدا کرنا تھے مشکل
وصل میں اِس واسطے دُکھتی رہی ہَیں

ایک پاگل کی طرح چاہا تھا اُس کو
قتل کا بھی فیصلہ کرتی رہی ہَیں

مَیں نہیں ترسی جہاں کی راحتوں کو
اُس کے ہونے سے سکوں پاتی رہی ہَیں

کر گیا وہ میری نس نس میں سرایت
محو اُس کے دھیان میں ایسی رہی ہَیں

خُوش رہی ہَیں ساتھ اُس کے رات ساری
اور پھر دن بھر پریشاں سی رہی ہَیں

مَیں اُسی کو ڈھونڈتی پھرتی تھی لیکن
اُس کی نظروں میں تو انجانی رہی ہُوں

آ کے پھر فرصت ملے ایسی نہ شاید
رات اُس کو لاکھ سمجھاتی رہی ہُوں

کیا کہا اُس نے نجانے وصل کی شب
اور کیا مفہوم پہناتی رہی ہُوں

سانس روکے رات اُس کے پاس پہنچی
اور واپس آنے تک سہمی رہی ہُوں

اُس کی سانسوں کی رفاقت راس آئی
جھوٹ یہ سچ کی طرح کہتی رہی ہُوں

کل اُسے ہر حال میں کرنا ہے رُخصت
سوچ کر یہ رات بھر روتی رہی ہُوں

ڈھل چکی تھی رات، گاڑی آ چکی تھی
تیرے جلنے تک فقط جیتی رہی مَیں

اِک قیامت آ گئی، مَیں جی اُٹھی پھر
منتظر پھر تیرے آنے کی رہی مَیں

تھک گئی جب تیرا رستہ تکتے تکتے
پھر تری تصویر کو تکتی رہی مَیں

نہ ملا جب بات کرنے والا تجھ سا
پھر تری باتوں کو دہراتی رہی مَیں

خُوش رہی مَیں تیرے لمحاں یاد کر کے
اور تیری سختیاں بھُولی رہی مَیں

کر لئے تھے مَیں نے سپنے جمع اِتنے
جیسے جاگی ہی نہیں سوئی رہی میں

کھو گئیں جب آسماں میں سب پتنگیں
بادلوں کے سنگ پھر اُڑتی رہی ہیں

لَوٹ کر آیا نہ جب تک وہ کبوتر
چھتریوں کے سائے میں بیٹھی رہی ہیں

کوئی بادل ہی نہ برسا بعد تیرے
آنسوؤں میں بھیگتی پھرتی رہی ہیں

رہ گئیں تھیں جو یہاں تیری کتابیں
تیری آنکھوں سے اُنہیں پڑھتی رہی ہیں

اور کیسے پورا کرتی خواہشوں کو
تجھ کو پانے کے لئے بِکتی رہی ہیں

دوسروں نے مجھ کو سستا ہی خریدا
صرف اپنے واسطے مہنگی رہی ہیں

مَیں ہنسا کرتی تھی اوروں پر ہمیشہ
آج اپنے آپ پر ہنستی رہی ہُوں

صرف غیروں سے نہیں تھی مجھ کو نفرت
چند اپنوں کو بھی ٹھکراتی رہی مَیں

سچّے لوگوں نے مُجھے جھوٹا ہی سمجھا
اور جھوٹوں میں سدا سچّی رہی مَیں

مَیں بہت کچّی رہی اپنے ہُنر میں
عیب میں لیکن بہت پکّی رہی مَیں

کشمکش سی کوئی مرگ و زیست کی تھی
بے سبب جیتی رہی مرتی رہی مَیں

دشمنوں نے جب زمیں میں کانٹے بوئے
اُس گھڑی بھی خاک سے لپٹی رہی مَیں

جانے والے مرے، یہ جانتے ہیں
ساتھ تیرے تو بہت سیدھی رہی ہیں

کیا وسیلے سے مرے، پاتا وہ منزل
ایک ناہموار پگڈنڈی رہی ہیں

کوئی کرتا ہی نہیں میری وکالت
جانے کس پاتال میں ڈوبی رہی ہیں

جس کی خوشبو نے دیا سونے نہ مجھ کو
جانے منظورِ نظر کس کی رہی ہیں

کر دیا حل دوسروں کے مسئلوں کو
اور اپنے آپ سے الجھی رہی ہیں

مجھ سے چھینا رزق میرا دوسروں نے
پھر انہی کے رزق پر پلتی رہی ہیں

پھول سرکنڈوں کے اُڑتے جا رہے تھے
ساتھ اُن کے جاؤں، للچاتی رہی ہیں

اب مسیحا کا خیال آتا نہیں ہے
جیسے اُس کو بھول کر اچھی رہی ہیں

سب نے محفل میں ظفرؔ پھیلائے پاؤں
اور سائے کی طرح سمٹی رہی ہیں

ایسا کھِلا وصال کا گُلزار ایک رات
یکدم مہک اُٹھے درو دیوار ایک رات

تالاب سے نہا کے وہ نکلا تو بولا چاند
رُک جا اِسی نواح میں اے یار ایک رات

مُجھ سے زیادہ گاؤں کا پیپل اُداس تھا
جس کے تلے ہُوا کوئی اقرار ایک رات

گندم کی بالیوں میں بجُو کے خوف سے
اُس نے کیا وصال سے انکار ایک رات

جاتا ہوں کیوں مَیں اُس کے علاقے میں بار بار
دُشمن بنا تھا گاؤں کا سردار ایک رات

یاد آگئیں وہ ساری پُرانی حویلیاں
چہرہ ہُوا وصال سے گُلنار ایک رات

ایسا لگا کہ جیسے ہو وہ میری غم گُسار
کُرلا رہی تھی کونجوں کی اِک ڈار ایک رات

کرتا رہا ہماری محبت کا فیصلہ
آنگن میں جمع سارا پریوار ایک رات

یکسر مُکر گیا تھا مَیں کلجُگ کی پریت سے
دل میں اُتر گیا تھا وہ اوتار ایک رات

وہ رات شبنمی تھی نہ بادل فلک پہ تھے
پڑتی رہی دلوں پہ مگر پھوار ایک رات

تالاب کے کنارے پرندے تھے اور مَیں
تُجھ بِن گزارنا ہوئی دشوار ایک رات

رستے میں میرا یار تھا سویا ہُوا نچنت
بے تاب دل نے کر دیا بیدار ایک رات

بتلا رہے تھے، چاند کے رتھ پر تھا میرا یار
آئے تھے اِس طرف کئی اسوار ایک رات

پُوجا کے پھُول رکھ دیئے قدموں میں یار کے
ایسا تھا اُس کو دِل پہ ادھیکار ایک رات

یہ عشق ایک رات میں ہو جائے گا امر
صدیاں نہیں مجھے تو ہے درکار ایک رات

چھت پر پہنچ گیا تھا میں غفلت میں اُس کے پاس
اُس نے کیا تھا مجھ کو خبردار ایک رات

رہنا خموش اور نہ دینا کسی کو دوش
دونوں کو بھا گیا تھا یہ معیار ایک رات

یُوں ہی نہیں فلک پہ یہ تابندہ کہکشاں
گزرا تھا اِس طرف سے مِرا یار ایک رات

نشّہ تھا ایسا وصل کا، اب یاد کچھ نہیں
مَیں تھا کہ وہ تھا مالک و مختار ایک رات

جِس کو اُسارتا رہا اوروں کے واسطے
مُجھ پر ہی آ گری تھی وہ دیوار ایک رات

جُگنو چمک رہے تھے سرِ آبجو جہاں
چہرہ ہوا تھا کوئی نمودار ایک رات

لکھّے تو تھے مگر نہیں بھیجے تھے جو اُسے
دکھلایا اُن خطوط کا انبار ایک رات

قائل تو ہو گیا تھا مگر پھر مُکر گیا
تقریر کی تھی مَیں نے دُھواں دار ایک رات

عمرِ عزیز مل سکے ، ایسا کہاں نصیب
اِک رات چاہیئے مِری سرکار ایک رات

آتی رہی ہو سنگ بکف جیسے اُس کی یاد
ٹوٹا نگار خانۂ پندار ایک رات

دیکھے نہیں تھے میں نے کبھی اُس کے سامنے
بے قیمت اِتنے درہم و دینار ایک رات

مٹّی میں ہو گیا تھا جو مٹّی مِرا وجود
حیرت میں پڑ گیا تھا مِرا یار ایک رات

وہ ہاتھ میرے ہاتھ میں آیا کہ دفعتاً
بجنے لگے تھے دل کے سبھی تار ایک رات

اِک دوسرے سے کٹ کے بہُت دُور جا گرے
آئی ہمارے بیچ میں تلوار ایک رات

ہم دونوں ایک ساتھ رہیں، طے کیا مگر
ظاہر ہوئے جدائی کے آثار ایک رات

شاید تھی زندگی کی وہی رات آخری
مَیں ہو گیا تھا عشق سے بیزار ایک رات

یُوں ہی نہیں سبھوں نے بنائیں کہانیاں
مَیں نے کئے ادا، کئی کردار ایک رات

یہ زندگی اُسی کے سہارے گُزار دی
تھوڑا بہت ملا جو مجھے پیار ایک رات

وہ لاجواب ہو گیا اظہارِ وصل سے
آئی تھی مجھ میں جُراتِ گُفتار ایک رات

آیا یقیں کہ میرا سخن بے اثر نہیں
کچھ تمتمائے تھے، ترے رُخسار ایک رات

شرطیں تھیں جتنی مَیں نے وہ کر دی تھیں پوری سب
اور ہو گیا تھا وصل کا حقدار ایک رات

مِل جاتی اُس کی دید کی مہلت اگر مجھے
مَیں دیکھ لیتا سارا ہی سنسار ایک رات

ملنا تھا اُس سے مجھ کو سحر دم کر راہ میں
حائل ہُوئی تھی صورتِ کہسار ایک رات

رم خوردہ اُس غزال کی رفتار دیکھ کر
رُک سی گئی تھی گردشِ سیّار ایک رات

ہو کے رہا اسیر اُنہی کا مَیں صُبح تک
کھینچے جو دائرے تہہِ پرکار ایک رات

کچھ بھی نہ تھا جو دل کے عوض مَیں خریدتا
دیکھا تھا مَیں نے حُسن کا بازار ایک رات

جاتا رہا وہ ذہن سے دن بھر اُتر اُتر
رستہ ہُوا خیال کا ہموار ایک رات

میری خبر نہیں تھی مگر میرے خون سے
لکھّا گیا تھا صُبح کا اخبار ایک رات

ویسے کہ جیسے شمع پگھلتی ہے رات بھر
آنکھیں تھیں اشکبار لگاتار ایک رات

پہلو میں تیرے کاش کبھی نکلے میرا دم
کچھ پاس ہے مرا تو مجھے مار ایک رات

اُس نے وضو کیا تھا سرِ شام جس جگہ
پھیلی رہی وہاں کوئی مہکار ایک رات

کرنے نہ دی نمازِ تہجد اُسے ادا
اِس درجہ ہو گیا مَیں گنہگار ایک رات

مَیں کر رہا تھا غیر کی نخوت کا تذکرہ
آ کر گری زمین پہ دستار ایک رات

روتا ہوں یاد کر کے کہ ٹھہرا نہ میرے پاس
دلدار ایک رات وہ دلدار ایک رات

اُس پار ہی اگر تھا ظفرؔ رات کا مزہ
ہم بھی گزارتے کبھی اُس پار ایک رات

تُجھ سے مِلوں یا ساجن سے
نکلوں کاش اِس اُلجھن سے

مَیں تو نہ بھُول سکوں گی تجھُے
کیا حاصل اِس اَن بَن سے

جاؤ مگر دیکھو تو سہی
لوہو بہت انکھیں سے

تُو جو گیا تو چلی گئیں
ساری خوشیاں جیون سے

جانے ملے کِس عُمر میں وہ
چاہا جس کو بچپن سے

ڈوب رہی ہوں اشکوں میں
مجھے غرض کیا ساون سے

ظالم کوئی زیادہ نہیں
دُنیا جیسی بیرن سے

کیا مَیں بتاؤں کتنے خار
اُلجھے میرے دامن سے

دیکھا کیسے تُونے اُسے
پُوچھا مَیں نے درپن سے

بیٹھ گئی آواز مری
ڈولی اُٹھی آنگن سے

مانگ رہی تھی اپنا لباس
بیر بہوٹی اُس تن سے

اُس نے گرم وجود کیا
میرے بدن کے ایندھن سے

مَیں کھیتوں میں بکھر گئی
روٹی کھاتی مکھّن سے

کیسے چھُوٹے میری جان
ایسے جھُوٹے بندھن سے

کاٹ کے رکھ دی گردن بھی
طوق نہ اُترا گردن سے

ایسے، کلائی گرفت میں لی
چھینی، چھنک مِرے کنگن سے

مَیں نے کوئی تکرار نہ کی
اپنے اُس من موہن سے

اُس نے مجھ کو باندھ لیا
اپنے پاؤں کی جھانجھن سے

رقص کی اُجرت دی اُس نے
عزّت لے لی رو کن سے

میلی ہو گئی گنگا پھر
بن اشنان ہی پاپن سے

پیاس بُجھائی رد ہی کی
تُو نے کون سے آسن سے

ایک جہان چلا آیا
ملنے مجھ بیراگن سے

پہلی بار تو خوف آیا
مجھ کو کالے انجن سے

پھر مَیں اُس سے لپٹ گئی
اپنے پُورے جوبن سے

جان لی اُس نے دل کی بات
میرے ہنستے نینن سے

چاند نے کھڑکی کیا کھولی
ہو گئے کمرے روشن سے

تُو نے رشتہ جوڑ لیا
سانس کی آون جاون سے

چادر ایک بنا ڈالی
مَیں نے دُھوپ کی کترن سے

اپنے آپ کو ڈھانپ لیا
مَیں نے اُس کی اُترن سے

سارا پانی کھینچ لیا
تُو نے میرے برتن سے

حال ہے کیا مرے ساجن کا
کیسے پُوچھوں سوکن سے

مُجھ سے اُجڈ پنجابی کو
عشق ہوا کشمیرن سے

میرے پاس چلی آئی
اُڑ کر خوشبو چندن سے

اکثر اِک مشتاق نگاہ
آ لگتی تھی چلمن سے

کبھی کبھی دلبر کی جھلک
دیکھتا تھا مَیں روزن سے

اُس کے لئے تو اکثر مَیں
لڑ جاتا تھا دشمن سے

رات اُلجھتے دیکھا سانپ
میں نے ایک سپیرن سے

آئی نہ کوئی تتلی ساتھ
گھوم آیا مَیں گلشن سے

خالی ہوں گئے اُس کے ہاتھ
گجرے لے لُوں مالن سے

کہہ نہ سکا مَیں دل کی بات
پہلی رات سہاگن سے

اکثر اپنی گود بھری
تُو نے میرے دامن سے

کب تک مَیں بہلاؤں دل
آڑھی ترچھی چِتون سے

تُو نے سیکھی نہیں اُڑان
میرے کبوتر لوٹن سے

بھوکا رہ لُوں بہتر ہے
پیٹ بھروں کیا کھُرچن سے

مَیں بھی کوئی خوش تو نہیں
ایسے جھوٹے بندھن سے

کیسی پھسلتی پھرتی ہے
چکنی چپڑی ، مکھّن سے

کیا تُو موم کی پُتلی ہے
جلتی ہے جو سوکن سے

آیا ہوں بیزار بہت
مَیں تیرے ہر لچھن سے

بُرا کیا جو پیار کِیا
مَیں نے ظفرؔ اُس ناگن سے

وہ دُور تھا قریب آ گیا تو چین آ گیا
اور آ کے روح میں سما گیا تو چین آ گیا

بدن تڑخ تڑخ اُٹھا بدل بدل کے کروٹیں
وہ میری پیاس جب بجُھا گیا تو چین آ گیا

گھرا ہوا تھا رات اِک ہوس بھرے ہجوم میں
نظر، نظر سے وہ مِلا گیا تو چین آ گیا

چمن میں پھُول پھُول سے لپٹ رہی تھیں تتلیاں
وصال رُت کا رس چکھا گیا تو چین آ گیا

رُکی ہوئی تھیں سانسیں اُس کے لمس کے فراق میں
وُہ دِل کی بات جب سُنا گیا تو چین آ گیا

جہاں مسہریوں پہ تھیں شکن کہانیاں
مجھے وہ خواب سا دکھا گیا تو چین آ گیا

یہ خوف تھا کہ رات کا سماں ہے اور اکیلی میں
وہ کوئی راستہ دکھا گیا تو چین آ گیا

کریدنے سے زخم دل کے یادیں تازہ ہو گئیں
وہ میری روح کو دُکھا گیا تو چین آ گیا

کہ اُس کے بعد جاگ اُٹھیں بدن کی ساری خواہشیں
وہ مجھ کو نیند سے جگا گیا تو چین آ گیا

کہ میری پور پور میں چمک اُٹھی تھیں بجلیاں
وہ ابر کی مثال چھا گیا تو چین آ گیا

بکھر رہا تھا جسم اُس کا نثری نظم کی طرح
غزل میں جب پرو دیا گیا تو چین آ گیا

سمجھ رہا تھا وہ، بغیر اُس کے مَیں ادھوری ہُوں
غرور اُس کا ٹُوٹ سا گیا تو چین آ گیا

وصال کے نشے میں ڈولتے بدن کے طاق میں
کوئی دیا سا وہ جلا گیا تو چین آ گیا

بدن رہا نہ پھر بدن دریدہ زندگی رہی
وہ میری راکھ جب اُڑا گیا تو چین آ گیا

کسی کسک کسی چبھن بغیر چین تھا کہاں
وہ میرے دل کو چیر سا گیا تو چین آ گیا

چُھپائے چھپ نہیں رہی تھی ہجر میں برہنگی
لباسِ وصل میں چُھپا گیا تو چین آ گیا

عذاب تھا بغیر جس کے، جاگنا تمام شب
وہ آ کے خود مجھے سُلا گیا تو چین آ گیا

تمام مہرے چاہتوں کے بِکھر رہے تھے در بدر
بساطِ عشق وُہ بچھا گیا تو چین آ گیا

مرے لہو کی بوند بوند جس کی نذر کی گئی
لہو میں آپ وہ نہا گیا تو چین آ گیا

وہ کونپلیں تھیں کونپلیں کہ دل سے اُٹھتی ہُوک تھی
خبر نہیں مگر وہ آ گیا تو چین آ گیا

گھری ہوئی تھی کائنات بے سُرے سکوت میں
وہ رات بانسری بجا گیا تو چین آ گیا

سسک رہی تھی کب سے میری جان اُس کے ہجر میں
وہ اپنی چھب مجھے دکھا گیا تو چین آ گیا

یہ میرا حوصلہ تھا چُپ تھی اُس کے ہر سلوک پر
وہ ساری رنجشیں بُھلا گیا تو چین آ گیا

چھلک رہا تھا حُسن کا وجود ایک عمر سے
وہ اپنی تشنگی بُجھا گیا تو چین آ گیا

وہ مور بھی اُداس تھے، چکور بھی اُداس تھے
قریب اُن کے چاند آ گیا تو چین آ گیا

سمجھ رہے تھے زہر سے بھرا ہوا سبھی اُسے
مگر وہ جام جب پِیا گیا تو چین آ گیا

ابد پکارتا رہا مجھے ازل کی اوٹ سے
مَیں اس کی سمت جب چلا گیا تو چین آ گیا

مجھے تلاش اس کی تھی کہ اُس کو تھی مری تلاش
معاملہ یہ طے کیا گیا تو چین آ گیا

کہا نہ جا رہا تھا تیرے ہجر میں جو ایک شعر
وہ ایک شعر کہہ لیا گیا تو چین آ گیا

مَیں رہتا کیوں نہ باوضو، مجھے تھی اُس کی جستجو
نماز کی طرح پڑھا گیا تو چین آ گیا

ہُوا جو ختم امتحاں تو ہو گیا وہ مہرباں
برس کے ٹکڑا ابر کا گیا تو چین آ گیا

سمٹ سمٹ کے یُوں ہی کر رکھی تھی زندگی تباہ
وہ مجھ کو جب بکھیر سا گیا تو چین آ گیا

ہوئے تھے ایک جسم و جاں، نہیں تھا کوئی درمیاں
حجاب سب وہ جب اُٹھا گیا تو چین آ گیا

خیال تھا کہ لَوٹ کر نہ آئے گا وہ اب اِدھر
دریچہ دل کا کھٹکھٹا گیا تو چین آ گیا

وہ زائروں کی ٹولیاں، وہ طائروں کی بولیاں
بہشت، باغ کو بنا گیا تو چین آ گیا

وہ سنگ تھا اُسے تراش کے بنایا دیوتا
مگر وہ دل کو جب لبھا گیا تو چین آ گیا

سُلا گیا تو سو گئی، جگا گیا تو جاگ اُٹھی
وہ بن کے شام، بیت سا گیا تو چین آ گیا

پڑے پڑے ہی بوڑھی ہو رہی تھی زندگی مری
وہ میری عُمر کچھ گھٹا گیا تو چین آ گیا

مجھے تو چین آ رہا تھا دوسروں کے چین سے
جو چین مجھ میں تھا، چلا گیا تو چین آ گیا

یہ آخری ہے رات، ہو گی پھر سحر وصال کی
مجھے جب اعتبار آ گیا تو چین آ گیا

اُجڑ رہی تھی شام بھی، اُکھڑ رہی تھی سانس بھی
وہ کوئی آس جب لگا گیا تو چین آ گیا

وصالِ طول کھینچتا تو میری جان کھینچتا
جو درمیاں میں ہجر آ گیا تو چین آ گیا

کہ چین آ نہیں رہا تھا میرا چین لُوٹ کر
وہ اپنی زندگی لُٹا گیا تو چین آ گیا

میں چاہتا تھا یار ہی رہے مرے خیال میں
خیال جب یہ راس آ گیا تو چین آ گیا

مَیں سانس لے رہا تھا ایک عہدِ ممکنات میں
وہ مجھ کو خاک میں مِلا گیا تو چین آ گیا

ابد کے پانیوں میں ڈوبتے ہوئے ظہور سا
سُراغ زندگی کا پا گیا تو چین آ گیا

یہ زندگی تو ڈوبتی ہوئی سی ایک ناؤ تھی
کوئی کنارہ وہ دکھا گیا تو چین آ گیا

ظفر مرا شمار بزدلوں میں تھا مگر میں آج
لہو اچھالتا ہوا گیا تو چین آ گیا

کیا تُو میری جان تھا
یا وہ مِرا گمان تھا

کُھلا نہیں یہ آج تک
تُجھ سے کیا پیمان تھا

کیا وہ پُورا ہو گیا
دل میں جو ارمان تھا

مشکل تھا وہ واقعہ
کہہ دینا آسان تھا

تُو ہی میرا میزباں
تُو ہی مِرا مہمان تھا

باہر موسم عام سا
دِل میں اِک طوفان تھا

پھرتا تھا مَیں بے مُہار
عشق مِرا زندان تھا

کر دیا جس نے بے خبر
تیرا ہی وہ دھیان تھا

پیار تھا پاگل پن مِرا
تُو بھی کیا نادان تھا

گرم تھی بُکّل یار کی
حجرے بیچ جہان تھا

چھنک رہی تھیں جھانجھریں
مہکا ہوا مکان تھا

انجانے سنجوگ سے
ایک جہاں سنسان تھا

کیسے دھمال مَیں ڈالتا
دِل میرا ویران تھا

ہو گئیں آنکھیں اشکبار
مَیں بھی تو انسان تھا

بیٹھی سیج سہاگ پر
جس پہ مجُھ کو مان تھا

آپ بتایا ہِیر نے
کھیڑا تو حیوان تھا

ہونٹوں کی بہتات میں
بوسوں کا فقدان تھا

جاتی ہوئی بہار تھی
مِٹتا ہوا نشان تھا

باطن میں پژمُردگی
ظاہر میں ہیجان تھا

مٹی ہوئی تھی آرزو
سجا ہوا دالان تھا

دیکھا غفلت میں اُسے
مَیں جِس پہ قربان تھا

ٹوٹ گئی وہ بانسری
دل یہ جِس کی تان تھا

بُجھی ہوئی تھی زندگی
جلا ہوا لوبان تھا

پنچھی میری پریت کا
بھُولا ہُوا اُڑان تھا

سُوکھ گئے تھے گُل سبھی
خالی ہر گُلدان تھا

باہر جوبن پر نکھار
اندر اِک سرطان تھا

پیروں میں زنجیر تھی
سر اُوپر قرآن تھا

ہیر کی جھُوٹی رُخصتی
کھیڑا بے ایمان تھا

رُخصت کے سامان میں
میرا بھی سامان تھا

آپ کہاروں نے کہا
وہ نانا بُطلان تھا

گھر اُس کے سسرال کا
میرے لئے شمشان تھا

رانجھے کی واسوخت کا
پُورا اِک دیوان تھا

رنگ کہیں وہ اُڑ گیا
جو میری پہچان تھا

گھر والے سب اوڈ تھے
گھر تو عالی شان تھا

دیکھ لیا تھا میری طرف
کیا یہ تیرا احسان تھا

حِصّہ تھا تُو وجود کا
دل کی ہر شریان تھا

مَیں بھی مائل ہو گیا
تیرا بھی میلان تھا

تُو نے مجھ کو کھو دیا
مَیں تیری مُسکان تھا

کاش تُو آتا اِس طرف
دِل بھی اِک استھان تھا

جیون اُس مٹیار کا
ہرا بھرا کھلیان تھا

کیا بوتا کیا کاٹتا
فصل سے بڑھ کے لگان تھا

بنجر زدہ زمین تھی
آفت زدہ کسان تھا

جس کی خود تردید کی
میرا ہی وہ بیان تھا

پروردہ تھا میرا ہی
مجھ سے ہی انجان تھا

نیلی پیلی ہو گئی
مرزے کو یرقان تھا

کیا آتا وہ ہوش میں
سینے میں پیکان تھا

نکلی دشمن صاحباں
مرزا تو ہلکان تھا

تنہائی کے بھیس میں
تُو تھا یا بھگوان تھا

اَنہونی کے گھاٹ پر
مرنے کا رجحان تھا

دیکھ کے تجھُ کو آئینہ
میری طرح حیران تھا

عشق رچا جب روح میں
صابر ظفر جوان تھا

نجانے کیوں تھی مَیں اُس کے بغیر بے کل سی
کہ کھُردرا سا تھا وہ اور مَیں تھی مخمل سی

مہک رہے تھے گلاب اُس کی گرم سانسوں کے
وہ شام کی تھی گھڑی، شام بھی تھی کاجل سی

جب اُس کے وصل کی حدّت مجُھے نصیب ہوئی
دہک رہی تھی مَیں اُس وقت سُرخ صندل سی

وہ میری پیاس بجُھانے ازل سے آیا تھا
اور اُس کے پاس مرے واسطے تھی چھاگل سی

خُدا کرے کہ مجُھے بھی اُڑا کے لے جائے
جو آسمان پہ کالی گھٹا ہے آنچل سی

مجھے سنبھال لیا یہ کرم کیا اُس نے
نشے میں چُور تھی مَیں، رات بھی تھی بوجھل سی

وہ میری روح میں روپوش تھا کہیں شاید
کہ جس کے ہونے سے پھُوٹی ہَیں نرم کونپل سی

چمک رہے تھے سحر دم یُونہی نہیں رُخسار
شبِ وصال مَیں کچھُ ہو گئی تھی صیقل سی

وہ پُورے گاؤں میں اِک میرے پاس آتا تھا
کہ مَیں تھی اُس کے لئے سایہ دار پیپل سی

یہی تھا عشق کہ وہ مجھ سے دُور رہ نہ سکا
وُہ نرم دُھوپ تھا اور مَیں چمکتے پیتل سی

بڑھا تھا رات وہ بے اختیار میری طرف
کہ جیسے مَیں تھی کوئی راگنی بلاول سی

پیالہ حُسن کا اُس کے لبوں کو چھُو آیا
کہ ہو گئی تھی مَیں رات آپ اپنے سانول سی

نہال کیسے نہ ہو پاتی پور پور مری
مجُھے نصیب تھی اِک شامِ وصل بادل سی

ہزار وصف تھے مجُھ میں جو اُس پہ کھُل نہ سکے
مَیں اُس کے ساتھ بھی رِہ کے تھی اُس سے اوجھل سی

یہی بہت ہے کہ تجھ تک پہنچ گئی ورنہ
مَیں جس طرف بھی گئی راہ میں تھی دلدل سی

وہ مجُھ کو دیکھ چکا، آکے میرے گاؤں میں
مَیں اُس کے واسطے سرسوں کی نرم گندل سی

ہوائے سرد سے ٹھٹھرا ہُوا تھا اُس کا وجود
مَیں اُس کی راہ میں بکھری ہوئی تھی بھُوبل سی

مگر وصال سے پوری طرح تھے آسودہ
تُنک مزاج تھا وہ، اور مَیں تھی چنچل سی

یہ ہوش تو مجھے آیا ہے اُس کے آنے سے
کہ ہو چلی تھی مَیں اُس کے بغیر پاگل سی

مَیں اُس کو بھول چکی ہُوں مگر ہے یاد اتنا
نشیلے نین تھے، صورت تھی اُس کی شیتل سی

یہ اور بات کہ تاریکیاں تھیں میرا نصیب
مَیں اُس کی راتوں میں جلتی رہی تھی مشعل سی

اُسے گزارا تو معنی کئی کھلے اُس کے
سمجھ رہی تھی مَیں جس زندگی کو مہمل سی

یہ حوصلہ تھا مِرا، پھر بھی تجھ تلک پہنچی
حویلی چاروں طرف سے تھی وہ مقفّل سی

نصیب جو بھی ہُوا وصل وہ غنیمت ہے
کہ مَیں نے کی تھی محبّت ہی نامکمل سی

مگر وہ مجھ سے لپٹنے سے باز کب آیا
مَیں اُس کے سامنے ظاہر ہوئی تھی چنچل سی

وہ میری پریت میں ڈوبا تو پھر نہیں اُبھرا
مَیں دیکھنے میں تو ویسے بہت تھی اتھّل سی

وہ ساری عمر کے دُکھ درد بانٹتا کیسے
کہ جِس نے توڑ دی یہ دل کی شاخ کومل سی

گزُر رہی ہو اَنا تھے آشرم میں جیسے حیات
ہَوا کے دوش پہ سب اور میں ہوں پیدل سی

مَیں آگری ہوں بہر حال تیرے قدموں میں
کہ جیسے تِتلی کوئی، نیم جاں سی، گھایل سی

مَیں زندہ ہوں کہ مسیحائی اُن لبوں نے کی
وگرنہ دُنیا تو میرے لئے تھی مقتل سی

نجانے کون سے کارِ جہاں پہ ہوں مامور
کبھی بحال سی مَیں اور کبھی معطّل سی

اگر چپکتی نہ اُس سے تو اور کیا کرتی
کہ بھیگا اُس کا بدن، اور مَیں تھی ململ سی

اندھیری شب میں سپُرد اُس کے مَیں نے جاں کر دی
ہُوئی گرفت جو محسوس اُس کے جنگل سی

سُنا ہے اب تو وہاں بھی اُگ آئے گُل بُوٹے
ہمارے وقتوں میں تھی جو زمین چٹیل سی

اب اُس کو سوچتی ہوں اور آہ بھرتی ہوں
کہ اب کہاں وہ ملاقات روزِ اوّل سی

بحال کیسے نہ ہوتی طبیعت اُس کی ظفرؔ
مَیں تھی سلوک میں اپنے، گوار گندل سی

منزل کھو جاتی تھی، رستہ رہ جاتا تھا
اور مَیں گرد کی صورت بیٹھا رہ جاتا تھا

مَیں روتا یا شاخیں شیشم کی روتی تھیں
ساون میں جب خالی جُھولا رہ جاتا تھا

ایک اندھیرا چھا جاتا تھا چاروں جانب
اور دُھندلا کے منظر سارا رہ جاتا تھا

باقی جو بینائی رہ جاتی تھی، اُس سے
جانے والے کو مَیں تکتا رہ جاتا تھا

کر دیتا تھا سارا حُسن حوالے میرے
پھر بھی کوئی نہ کوئی پردہ رہ جاتا تھا

گاگر بیچ سما جاتا تھا سارا پانی
مَیں پنگھٹ پر بیٹھا پیاسا رہ جاتا تھا

یہ جو تنہائی ہے نئی نہیں ہے کوئی
پہلے بھی مَیں ایسے تنہا رہ جاتا تھا

دُھوپ میں جلتا چھوڑ کے چل دیتا تھا اکثر
لیکن اُس کی یاد کا سایا رہ جاتا تھا

غائب ہو جاتی تھی مُرشد والی صورت
سنّاٹے میں ڈوبا حُجرا رہ جاتا تھا

نیند مِری آنکھوں سے رُخصت ہو جاتی تھی
بس آنکھوں میں اُس کا سپنا رہ جاتا تھا

بھیک مجُھے دیدار کی ملتی تھی کب اُس سے
بس نینوں کا خالی کاسہ رہ جاتا تھا

جان گیا تھا تجھ بِن جینا سہل نہیں ہے
اِس حالت میں باقی مَرنا رہ جاتا تھا

زعم بہت تھا اُسے لگا لوں گا باتوں میں
لیکن رنگ سخن کا پھیکا رہ جاتا تھا

سوچتا تھا مَیں کہہ دوں گا ہر بات زبانی
لکھّا ہُوا سب گھر میں رکھّا رہ جاتا تھا

مَیں یہ سمجھتا، واپس آئے گا نہ کبوتر
جب کوئی پَر شاخوں میں اٹکا رہ جاتا تھا

دُور نہ ہوتا تھا مَیں اِک پل اُس گُل رُخ سے
دل میں کھٹکتا پھر بھی کانٹا رہ جاتا تھا

پڑھنے سبق جب عشق کا جاتا تھا مکتب میں
اکثر گھر میں میرا بستہ رہ جاتا تھا

اِس درجہ بے وزن لگن ہوتی تھی میری
مَیں ہر باٹ کے آگے ہلکا رہ جاتا تھا

یہ تھا محض خیال کہ چاہت کی صورت میں
ہونٹوں پر ہونٹوں کا تحفہ رہ جاتا تھا

چھین کے لے جاتا تھا صبر و قرار وہ مجُھ سے
مَیں بچّوں کی صورت روتا رہ جاتا تھا

غیر کے ساتھ چلا جاتا تھا سامنے میرے
پھر میرا اُس سے کیا ناتا رہ جاتا تھا

موت کی نیند سُلا دیتا تھا ہر خواہش کو
پر عشق اُس کا مجھ میں زندہ رہ جاتا تھا

قتل مجُھے کرنے آتے تھے حامی اُس کے
مَیں کونے کھدرے میں دُبکا رہ جاتا تھا

جس جملے میں شامل ہوتی تھی سچّائی
چیک کے تالو سے وہ جملہ رہ جاتا تھا

غافل ہو جاتا تھا وہ تونین ملا کے
روح و بدن میں اس کا نشّہ رہ جاتا تھا

مال و زر تو سارا غیر ہی لے جاتے تھے
میرے ہاتھ میں کھوٹا سکّہ رہ جاتا تھا

قلم اُٹھانے کی فرصت ہی کب تھی اُس کو
کاغذ دل کا اکثر کورا رہ جاتا تھا

جانے کہاں کھو جاتے لب رس چوسنے والے
سرد ہوا میں ٹھٹھرتا گنّا رہ جاتا تھا

رات اُتار کے رکھ دیتا تھا گہنے سارے
ہاتھوں میں البتہ چھلّا رہ جاتا تھا

آ جاتا تھا توڑ کے رسموں کی دیواریں
سارا گاؤں ہکّا بکّا رہ جاتا تھا

ایک خیالی شخص کی صورت آنکھوں میں تھی
ٹوٹ کے پھر وہ دھیان کا ناتا رہ جاتا تھا

عشق میں جلتے دل کی حالت کیا میں بتاؤں
آدھا جل جاتا تھا، آدھا رہ جاتا تھا

اُسے لگا لیتا تھا باتوں میں ہر کوئی
میں کم گو تھا اکثر کُڑھتا رہ جاتا تھا

پیار تو تھا قد آور لیکن اُس کے آگے
ایڑھی اُٹھا کر بھی میں چھوٹا رہ جاتا تھا

جانے لگتا تھا میں جب بھی گاؤں اُس کے
گھوڑا کھُل جاتا تھا، تانگہ رہ جاتا تھا

مَیں اُسے مضبوطی سے باندھ کے رکھتا پھر بھی
رِشتہ کھُل جاتا تھا کھونٹا رہ جاتا تھا

جب بھی سوچتا تھا مَیں آزادی کے حق میں
پنچھی اُڑ جاتا تھا، پنجرہ رہ جاتا تھا

میرے ساتھ سلوک کیا تھا اُس نے ایسا
مَیں اپنے پر آپ ہی ہنستا رہ جاتا تھا

جس کے ہونے سے تھے ہم دونوں ہم رشتہ
کَسنے پر بھی بیچ وہ ڈھیلا رہ جاتا تھا

اب مَیں سوچتا ہُوں تو یاد نہیں کچھ آتا
اُس کے جانے پر بھی کیا کیا رہ جاتا تھا

اُس کے بغیر بکھر کے رہ جاتا مَیں ایسے
شاخ سے ٹوٹ کے جیسے پتّا رہ جاتا تھا

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہتا تھا مَیں
کہنے والا سارا قصّہ رہ جاتا تھا

پل میں چل دیتا تھا پھیر کے آنکھیں مجھ سے
اور اُتر کے سارا نشّہ رہ جاتا تھا

آنکھوں کے آگے وہ آنکھیں رہ جاتی تھیں
چہرے کے آگے وہ چہرا رہ جاتا تھا

چھا جاتے تھے لیے، محرومی کے سائے
خاک میں مل کے ارماں دل کا رہ جاتا تھا

جانے کیوں مَن کی بھٹّی میں پریم کٹورا
آگ جلانے پر بھی کچّا رہ جاتا تھا

جاتا تھا وہ پھیر آنے کا وعدہ کر کے
میرے ہاتھ میں درد کا پلّہ رہ جاتا تھا

چوکیدار بھی سو جاتا تھا رات کو اکثر
مَیں ہی اُس کی گلی میں تنہا رہ جاتا تھا

کب دیتا تھا اپنے حُسن کا صدقہ مجھ کو
ہاتھ یہ اُس کے آگے پھیلا رہ جاتا تھا

میں کتنا مرتا تھا اُس پر، ظفرؔ کہوں کیا
بس اِتنا مَرتا تھا، زندہ رہ جاتا تھا

١. اِبتدا
٢. دُھواں اور پھُول
٣. پاتال
٤. جتنی آنکھیں اچھّی ہوں گی
٥. دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے
٦. لہو ترنگ
٧. دکھوں کی چادر
٨. بارہ دری میں شام

صابر ظفر کے مطبوعہ شعری مجموعے

یہ اُردو کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں شاعر نے نہ صرف اپنے دِل کا حال لکھا ہے بلکہ اپنی محبوبہ کے دل کا حال بھی رقم کر دیا ہے اس میں عشق کی ایسی سچی کیفیتیں لکھی ہیں کہ جب تک انسان کو کسی محبوبہ سے سچی محبت نہ ہو لکھی ہی نہیں جا سکتیں، مَیں تو اِسے عشق کا وہ صحیفہ کہوں گا کہ جس میں عاشق اور اُس کے محبوب دونوں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں، عشق کا اتنا سچا اور تفصیلی بیان کم دیکھنے میں آتا ہے، اسے پڑھ کر آپ سمجھ جائیں گے کہ سچا عشق کیا ہوتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ یہ غزلیں ایسی آٹو بیاگرافی معلوم ہوتی ہیں کہ عاشق کی ایسی آٹو بیاگرافی کبھی لکھی نہیں گئی اور جب محبوبہ اپنا حال سُنانے لگتی ہے تو وہ حال بھی دِل میں اس طرح اُتر جاتا ہے کہ جیسے تیر تھا جو دِل میں اُتر گیا۔

قمر جمیل